قومی اسمبلی میں دس اقلیتی نمائندے ہیں جو اپنی اپنی برادریوں کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہو کر ایوان میں آئے ہیں۔ اور بجا طور پر ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی برادری کو درپیش مسائل کے حل میں مدد دے اور اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے تاکہ جب بھی دوبارہ اسے اپنی برادری سے اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت پڑے تو وہ کامیاب رہے۔ قومی اسمبلی کے اقلیتی ارکان میں سے ایک جناب پیٹر جان سہوترا وفاقی وزیر مملکت برائے اقلیتی امور ہیں اور دوسرے رانا چندر سنگھ وزیر برائے انسداد منشیات کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شاید یہ اعزاز دنیا کی تیسری بڑی مسلم مملکت "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہی کو حاصل ہے کہ اس کی تقریباً تین فیصد اقلیتی آبادی کو مرکزی کابینہ میں اتنی اہمیت حاصل ہے۔

جناب پیٹر جان سہوترا اور جناب رانا چندر سنگھ کو اپنی سرکاری حیثیت کے تحت دوسرے اقلیتی نمائندوں پر اس لحاظ سے تفوّق حاصل ہے کہ انہیں ذرائع ابلاغ اور بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی وژن پر نسبتاً زیادہ Coverage ملتی ہے۔ اس کا بڑا سبب جہاں ذرائع ابلاغ پر حکومت کا کنٹرول ہے، وہیں وزراء کی حیثیت سے انہیں حکومتی پالیسیوں کے جواز، وضاحت اور دفاع کے لیے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے مسلسل رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم اقلیتی ارکان اسمبلی میں سے اخبار نویسوں کی دلچسپی کا مرکز جناب جے۔ سالک ہیں جو اپنی ذہانت سے آئے دن احتجاج کا نیا انداز اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ٹاٹ کے لباس سے لے کر صلیب پر لٹکنے، سر پر خاک ڈالنے، اپنے گھر کے سامان کو جلا دینے اور خود سوزی کی دھمکی دینے کے بعد اب وہ قومی اسمبلی میں اپنی نشست پر تشریف رکھنے کی بجائے زمین پر بیٹھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے حالیہ احتجاج کا سبب تعمیر وطن پروگرام کے تحت ارکان اسمبلی کو ملنے والی رقم کی مقدار ہے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۲ء کی اخباری اطلاع کے مطابق "جناب جے۔ سالک اس وقت ایوان سے واک آؤٹ کر گئے تھے جب انہوں نے تعمیرِ وطن پروگرام کے تحت ڈیڑھ کروڑ روپے کے فنڈز کا مطالبہ کیا اور کہا کہ مجھ پر حکومت دباؤ ڈال رہی ہے کہ میں اس کی حمایت کروں۔ ورنہ مجھے صرف پچاس لاکھ روپے کے فنڈز دیے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ڈیڑھ کروڑ کے فنڈز دیے جائیں جو سرکاری ارکان کو دیے جا رہے ہیں۔" ان کی تقریر پر وفاقی وزیر بلدیات جناب غلام دستگیر نے وضاحت کرتے ہوئے ایوان کو بتایا کہ ان کی حکومت نے جناب جے۔ سالک پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ نقد رقم مانگ رہے ہیں جب کہ ہم نے ان سے کہا ہے کہ وہ ترقیاتی اسکیمیں پیش کریں۔ مگر وہ نہیں مانتے۔"

جناب جے۔ سالک اور حکومت کے درمیان چلنے والا یہ تنازعہ انصاف اور بھائی چارے کی فضا میں حل ہو جانا چاہیے تھا مگر مہینوں گزرنے کے باوجود یہ معاملہ لٹکا چلا آ رہا ہے۔ ان دنوں جب ملک کے تین صوبوں اور آزاد کشمیر میں لاکھوں افراد سیلاب سے متاثر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر ناگہانی آفت کے شکار اہلِ وطن کی بحالی کی کوشش کی جائے اور اس حوالے سے جناب جے۔ سالک اور حکومت قوانین و ضوابط کے تحت باہمی اختلاف دور کر لیں۔

جناب جے۔ سالک قابلِ احترام رکن قومی اسمبلی ہیں مگر وہ جمہوری اصولوں کے نام پر غیر جمہوری رویّہ اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جہاں بہت سی دوسری باتیں اپنے مخصوص انداز میں کرتے رہتے ہیں، وہیں یہ بات بھی ان کے حوالے سے اخبارات میں آ رہی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست نہیں بننے دیں گے۔ تحریکِ پاکستان کا ایک عام طالب علم بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے الگ وطن کے لیے جدوجہد میں جس نظریے اور آئیڈیالوجی نے بنیادی کردار ادا کیا تھا وہ اسلام تھا، اور اسلام محض کوئی رسومات اور عبادات کا دین نہیں بلکہ سیاسیات، معاشیات اور معاشرت کے بارے میں اس کی واضح تعلیمات ہیں۔ پاکستان کی مسلم اکثریت اس بات کو اپنا حق اور جدوجہد کا حاصل سمجھتی ہے کہ پاکستان "اسلامی جمہوریہ" ہو۔ ۱۹۵۶ء کے دستور میں یہی لکھا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے دستور میں جب جدّت پسند حکمرانوں نے اس کی اسلامی حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی تو عوامی احتجاج کے پیشِ نظر پہلی ترمیم کے ذریعے وہ تمام اسلامی دفعات بحال کر دی گئیں جو ۱۹۵۶ء کے دستور میں شامل تھیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو سے بڑھ کر پاکستان کا کون سا حکمران لبرل اور سیکولر اندازِ سیاست اپنائے گا مگر وہ بھی اسلام کو اپنا دین خیال کرتے تھے اور ان کے دورِ اقتدار میں تیار شدہ دستور (۱۹۷۳ء)، جس کے احیاء کے لیے برسوں جدوجہد کی جاتی رہی، میں نہ صرف ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر کی تمام اسلامی دفعات موجود رہیں بلکہ پہلے دساتیر سے بڑھ کر اس میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔

جناب جے۔ سالک اپنی سیاسی وابستگیوں اور پسند و ناپسند کے حوالے سے شاید موجودہ برسرِ اقتدار جماعتوں کو توچنداں اہمیت نہ دیتے ہوں مگر ان کی نظر میں بھی ذوالفقار علی بھٹو کا ایک مقام ہے اور ذوالفقار علی بھٹو کسی مذہبی - سیاسی جماعت کے رہنما نہیں تھے۔ جب پاکستان کی مسلم اکثریت نے دستوری طور پر اپنے آپ کو اس بات کا پابند کر رکھا ہے کہ وہ پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایسی جمہوریہ بنائے گی جس میں قوانین اور نظامِ زندگی قرآن و سنت کے مطابق ہو گا تو جناب جے۔ سالک کے اس دعوے میں کتنی جمہوریت دوستی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست نہیں بننے دیں گے۔

جناب جے۔ سالک نے سیاست کا جو انداز اپنایا ہے، یہ کس حد تک باشعور مسیحی برادری کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے؟ ماضی میں بہت دور تک جانے کے بجائے دسمبر ۱۹۹۱ء سے اب تک اُن کے ایک دو اقدامات پر نظر ڈال لی جائے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کو پنجاب میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے۔ جناب سالک نے انتخابات کی تاریخ کو مسئلہ بنایا کہ یہ مسیحیوں کے تہوار کے دن ہیں، اس لیے انتخابات ملتوی ہوں۔ حکومتِ پنجاب نے انتخابات ملتوی نہ کیے اور جناب جے۔ سالک نے جلوس نکالنے کے بعد آخر الامر ریگل چوک لاہور میں اپنے آپ کو صلیب پر لٹکا لیا مگر اس سب کچھ کے باوجود بلدیاتی اداروں کی اقلیتی نشستوں پر انتخاب لڑنے والے بدستور میدان میں جمے رہے۔ عام مسیحیوں نے اُن کے لیے ووٹ ڈالے اور انتخابات پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ان کا صلیب پر لٹکنے کا عمل مسیحی برادری کے اندر خلفشار کا باعث بنا۔ جہاں اُن کے کچھ قریبی لوگوں نے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے کے مترادف قرار دیا، وہیں وہ اپنی برادری کی تنقید کا نشانہ بنے۔ کہا گیا کہ "جے۔ سالک نے مقدس صلیب کو استعمال کر کے مسیحی تعلیمات اور اُن کے تقدس کی توہین کی ہے۔" ایک معروف مسیحی کرنل ایل۔ کے۔ ٹریسلر نے کہا کہ "کرسمس کے موقع پر جعلی طور پر مصلوب ہونا دینِ عیسائیت کا مذاق اڑانے کی کوشش ہے اور جے۔ سالک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے جو کفر ہے۔"

بطور احتجاج مصلوب ہونے پر حکومتِ پنجاب نے جناب جے۔ سالک کو گرفتار کیا اور پھر رہا کر دیا۔ اس کے بعد چند روز دونوں طرف سے بیان بازی ہوتی رہی۔ نتیجہ صرف یہ نکلا کہ جناب سالک نے دوبارہ ٹاٹ کا لباس پہن لیا جو تقریباً ایک سال پہلے قومی اسمبلی میں تلاوتِ قرآن سے کارروائی کا آغاز کرنے پر انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ رہائی کے بعد انہوں نے پریس کو بتایا تھا کہ "آئندہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں وہ سر میں راکھ ڈال کر ننگے پاؤں حکومت کے ظلم و تشدد کے خلاف بطور احتجاج شامل ہوں گے اور اسی طرح قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں جاتے رہیں گے تاوقتیکہ حکومت جھوٹ اور نفرت پھیلانے والوں کے خلاف کوئی بل پارلیمنٹ میں پیش نہ کرے۔"

اس کے بعد جناب جے۔ سالک نے قومی اسمبلی سے باہر اور ایوان اسمبلی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے، اس پر جناب ڈیوڈ خان کا تبصرہ دلچسپ ہے جو ماہنامہ "کاریتاس" نے اپریل ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔

- جناب جے۔ سالک نے بھی کوئی کمال نہ کیا۔ وہ بھی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ بجائے سڑکوں پر آنے کے جناب جے۔ سالک اسمبلی میں بات کریں تو بہتر ہے۔ آج تک جے۔ سالک نے اسمبلی میں جو کچھ کیا ہے، وہ خیر اسمبلی کی کارروائی کا حصہ ہے۔ صدر

کے خطاب پر تقریر، خلیج کے موضوع پر تقریر، بجٹ پر تقریر کوئی بڑا کام نہیں کیوں کہ یہ تو رسمی کارروائی ہوتی ہے، وہ ہر ہوش مند آدمی کر سکتا ہے۔ یونین لیڈر بھی عام بحث اخبارات میں چھپوا سکتا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد اس قسم کی تقریر پر بحث کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے کیا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے کوئی تحریک استحقاق یا کوئی بل پیش کیا ہے؟ یا کوئی پرائیویٹ بل پیش کیا ہے یا کوئی قانون سازی کے لیے بل پیش کیا ہے؟ کیا آپ نے کوئی کسی قانون سازی میں اپنی رائے دی ہے؟

اب انہوں نے حکومت سے اختلاف پر اپنا گھریلو سامان جلایا اور پھر "خاک بر سر ہڑتال" کی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اُنہوں نے اپنے گھر کا جو سامان جلایا ہے، یہ وہ سیلاب زدگان کے لیے فنڈ میں دے سکتے تھے تو اُنہوں نے فرمایا کہ "آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سامان میرے لیے فالتو تھا اور میں نے اسے پھینکنے کی بجائے جلانا زیادہ مناسب سمجھا۔ دراصل ایسی وجہ نہیں۔ میں وہ سامان جلا کر اس کی روشنی میں میاں نواز شریف کی بند آنکھیں کھولنا چاہتا تھا۔ اب دیکھیں لاکھوں افراد کا سامان پانی میں بہہ چکا ہے اور میں نے اپنا سامان جلا لیا۔ اس طرح سے میری اور اُن کی کلاس ایک ہو گئی۔"

کاش! اس موقع پر سامان جلا کر بے سہارا لوگوں کی کلاس میں شامل ہونے کی بجائے اپنے وسائل میں اُنہیں شریک کر کے جناب جے۔ سالک اُن کی کلاس میں شامل ہوتے تو اُن کا عمل مسیحیت کے زیادہ قریب ہوتا۔